2182

6x6
36x3
108

24
24
24
24

96
96
96
288

24x4
96x4
4

آنکھیں بھر آئی تھیں

ستارہ نصیب شب

ستارہ نصیب شب

امیج

بشیر بدر

نصرت پبلشرز ۔ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔ ۳

Image
Image
IMAGE
IMAGE
Image

پروفیسر آل احمد سرور کی نذر

پروفیسر آل احمد سرورؔ

کی

نذر

Nusrat Publishers
Lucknow
Victoria Market
Aminabad Pa
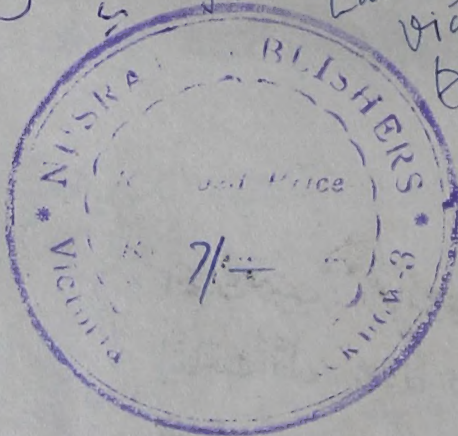
IMAGE
BASHEER BADRE

انتخاب و ترتیب : اعجاز عبید

اِشاعت اوّل : جولائی ۱۹۷۳ء

قیمت : ۵۔ روپے

طباعت : نامی پریس ۔ لکھنؤ

ناشر : نصرت پبلشرز ۔ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

سسکتے آب میں کس کی صدا ہے
کوئی دریا کی تہہ میں رو رہا ہے

سویرے میری ان آنکھوں نے دیکھا
خدا چاروں طرف بکھرا پڑا ہے

اندھیری رات کا تنہا مُسافر
مری پلکوں پہ اب سہما ہوا ہے

سمیٹو اور سینے میں چھپا لو
یہ سناٹا بہت پھیلا ہوا ہے

حقیقت سُرخ مچھلی جانتی ہے
سمندر کتنا بوڑھا دیوتا ہے

پکے گیہوں کی خوشبو چیختی ہے
بدن اپنا سنہرا ہو چکا ہے

ہماری شاخ کا نوخیز پتّہ
ہوا کے ہونٹ اکثر چومتا ہے

مجھے ان نیلی آنکھوں نے بتایا
تمہارا نام پانی پر لکھا ہے

--

دہکتی دھوپ سمندر ہے، یہ جزیرے ہیں
گھنے درخت جو سڑکوں پہ سایہ کرتے ہیں

عجیب شہر ہے یہ اسکے آسمان پہ بھی
لہو میں ڈوبے ہوئے سُرخ سُرخ کپڑے ہیں

وہ کوئی اور تھا شب خون مارنے والا
ہمیں نہ مارو کہ ہم بے ضرر فرشتے ہیں

یہ پتھروں کا ہے جنگل چلو یہاں سے چلیں
ہمارے پاس تو گیلی زمیں کے پودے ہیں

عرق نچوڑنے والی مشین پیاسی ہے
ابھی ہمارے بدن سبز "کچے کچے" ہیں

پھر ان کے نیچے درندوں کے نام کس نے لکھے
ہمیں یقین ہے یہ سب ہمارے چچا کے گھر ہیں

عظیم دشمنو، چاقو چلاؤ موقع ہے
ہمارے ہاتھ ہماری کمر کے پیچھے ہیں

کہانیوں کی کئی باتیں سچ ہوئیں جیسے
سنہرے شہر سمندر میں بہتے رہتے ہیں

--

سبز پتّے دھوپ کی یہ آگ جب پی جائیں گے
اُجلے فر کے کوٹ پہنے ہلکے جاڑے آئیں گے

گیلے گیلے مندروں میں بال کھولے دیویاں
سوچتی ہیں ان کے سورج دیوتا کب آئیں گے

سُرخ، نیلے چاند تارے ڈوبتے ہیں برف پر
کل ہماری طرح یہ بھی دھند میں کھو جائیں گے

دن میں دفتر کا قلم، مِل کی مشینیں سب ہیں ہم
رات آئے گی تو پلکوں پہ ستارے آئیں گے

شام تک میلہ ہے پاگل پیڑ پنچھی کس کے میت
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

دل کے ان باغی فرشتوں کو سڑک پر جانے دو
بچ گئے، تو شام تک گھر لوٹ کر آ جائیں گے

تنہا طے کرنا ہے سب کو رات کا سارا سفر
جھاڑیوں میں جگنوؤں کے قافلے کھو جائیں گے

--

خوشبو کو تتلیوں کے پروں میں چھپاؤں گا
پھر نیلے نیلے بادلوں میں لوٹ جاؤں گا

دیوانہ وار مجھ سے لپٹ جائے گی ہوا
میں سرخ سرخ پھولوں میں جب مسکراؤں گا

سونے کے پھول پتے گریں گے زمین پر
میں زرد زرد شاخوں پہ جب گنگناؤں گا

وہ جا کے خوشبوؤں کا بدن چوم آئیں گے
رنگوں کے وہ فرشتے ہوا میں اڑاؤں گا

یہ لکڑیاں جو خشک ہیں بے برگ و بار ہیں
ان کو میں اپنی آگ میں جلنا سکھاؤں گا

دینار خوب برسیں گے آنگن میں ساری رات
میں خواب کے شجر کی وہ شاخیں ہلاؤں گا

ڈھل جائیں گی بدن پہ جمی دھوپ کی تہیں
اپنے لہو میں آج میں ایسا نہاؤں گا

اک پل کی زندگی مجھے بے حد عزیز ہے
پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور ٹوٹ جاؤں گا

یہ رات پھر نہ آئے گی بادل برسنے دے
میں جانتا ہوں صبح تجھے بھول جاؤں گا

آنکھیں ملے گی سمجھے گی یہ کوئی خواب ہے
برسوں کی سوئی رات کو ایسا جگاؤں گا

مٹی تری صدا ہوں میں ٹھنڈے ستاروں کے
خاموش ہونٹ چومتے ہی ڈوب جاؤں گا

اس دن بجائے اوس کے ٹپکے گا سرخ خون
تلوار لے کے جب میں خلاؤں میں جاؤں گا

جب رات کے سپرد مجھے کرنے آؤ گے
رومال روشنی کا ہوا میں اُڑاؤں گا

رہ رہ کے ایک پھول مہکتا ہے خون میں
اس کو بدن کی مٹی کے نیچے دباؤں گا

آنگن میں ننھے ننھے فرشتے لڑیں گے جب
بھوری شفیق آنکھوں میں میں مسکراؤں گا

--

اُڑتی کرنوں کی رفتار سے تیز تر، نیلے بادل کے اک گاؤں میں جائیں گے
دھوپ، ماتھے پہ اپنے سجا لائیں گے سائے، پلکوں کے پیچھے چھپا لائیں گے

بَرف پر تیرتے روشنی کے بدن، چلتی گھڑیوں کی دو سوئیوں کی طرح
دائرے میں سدا گھومنے کے لیے آہنی محوروں میں جڑے جائیں گے

جب ذرا شام کچھ بے تکلّف ہوئی، برگزیدہ فرشتوں کے پُر پنج گئے
رات کا ٹیپ سورج بجا دے اگر، موم کے پاک جسم کے پگھل جائیں گے

سُرمئی ہڈیوں، خاکی اشجار نے، لوٹنے والوں کا خیر مقدم کیا
ہم نے تو یہ سُنا تھا کہ ان لوگوں پر چاند تارے بہت پھول برسائیں گے

مختلف سمت میں اک کسی شخصیت، یاد کا پھول بن کر بکھر جائے گی
دھوپ کے کھینچتے ہوئے ہاتھ جب، نیم کے پھول سڑکوں پہ برسائیں گے

ناریل کے درختوں کی پاگل ہوا، کھل گئے بادباں لوٹ جا۔ لوٹ جا
سانولی سرزمیں پر میں اگلے برس پھول کھلنے سے پہلے ہی آجاؤں گا

گرم کپڑوں کا صندوق مت کھولنا ورنہ یادوں کی کافور جیسی مہک
خون میں آگ بن کر اتر جائے گی صبح تک یہ مکاں خاک ہو جائے گا

بید کے زرد مونڈھے پہ بیٹھی ہوئی شام نے اٹھ کے بتی جلائی نہیں
روشنی کا فرشتہ بڑی دیر تک دستکیں دے کے واپس چلا بھی گیا

میرے بچپن کے مندر کی وہ مورتی دھوپ کے آسماں پر کھڑی تھی مگر
ایک دن جب مراقد مکمل ہوا اس کا سارا بدن برف میں دھنس گیا

جیسے یہ جانتا ہو طلسمی ہوا اس پرندے کو واپس نہیں لائے گی
خشک ڈنٹھل نے اک فاختہ کی گھنی بند پلکوں کا اس طرح بوسہ لیا

آسماں کے سنہرے پھلوں کی طرح شہد سے تھرتھراتا تھا اپنا بدن
ایک دن برف زاروں سے دریا چلے، آنسوؤں کا نمک خون میں گھل گیا

لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی واپس چلا جائے گا

ان گنت کالے کالے پرندوں کے پر ٹوٹ کر زرد پانی کو ڈھکنے لگے
فاختہ دھوپ کے پُل پہ بیٹھی رہی رات کا ہاتھ چپ چاپ بڑھتا رہا

--

کچے پھل کوٹ کی جیب میں ٹھونس کر جیسے ہی میں کتابوں کی جانب بڑھا
گیلری میں چھپی دوپہر نے مجھے ناریل کی طرح توڑ کر پی لیا

پٹریوں پر کھڑے دو نئے ڈبوں نے جب گھڑی طے کیا ہم نہ ہوں گے جُدا
سبز پلکیں جھکیں، دیو آگے بڑھا ۔ ایک ڈبہ اکیلا کھڑا رہ گیا

دھند کی بند پلکیں کترتے ہوئے سائیکل پہ چلیں دھوپ کی قینچیاں
رنگ والی ہواؤں کے کرتے اُڑے صبح کا سائرن دے رہا ہے صدا

بند پلکوں پہ جو پھول رکھ کر کہے آؤ ہم برف کی چوٹیوں پر چلیں
سبز قالین پر دھوپ لیٹی ہوئی سوچتی ہے نہ جانے وہ کب آئے گا

ایک مانوس بے نام کہرے میں سب اپنے اندر ہی اندر سُلگنے لگے
ان کے سینوں پہ جب سرمئی شام نے درد کا پاک لوبان سُلگا دیا

ریشمی بالوں والے کسی پھول کی گرم ٹوپی پہنسی جھاڑیوں میں ملی
سُرخ خرگوش کے وہ تعاقب میں گم وادیوں میں اترتا چلا ہی گیا

پھٹے کاغذوں، چیتھڑوں، زرد پتوں، کتابوں کے اوراق لے کر ہوا سر پٹکتی چلی جا رہی ہے
یہ دونوں کا باہم عجب سلسلہ ہے زمیں کے بدن پر جہاں گھاؤ دیکھا ہوا اس کو بھرتی چلی جا رہی ہے

سبھی کاپیوں اور کتابوں پہ گہری اُداسی جمی تھی، اسے پہلے جھاڑا، کبوتر کا خوں گرم ہونٹوں پہ پھیرا
کلینڈر میں بیٹھے ہوئے سُرخ بلّے کی مونچھوں کو چوما اور اب وہ اندھیری سڑک پار کرتی چلی جا رہی ہے

"کھڑی موج" کے لہر کھاتے کٹاؤ کے نیچے بندھی زرد ساری کے اوپر عجب جان لیوا سا حصّہ کھلا ہے
یہ پسماندہ قصبے کی پتلی سڑک پر ٹریفک کا ہے (سپاہی کرے کیا) بہت بھیڑ بڑھتی چلی جا رہی ہے

یہ کیسی صدا ہے جوان دھوپ کھاتی ہوئی کھیتوں کو بلاتی ہے آؤ، کبھی جھاگ کے ان پہاڑوں میں آؤ
کھلے صابنوں کی تھرکتی ندی میں کبھی تم بھی آؤ، تبھی یہ لہکتی بہکتی —— چلی جا رہی ہے

مرے پاؤں اسٹیل، سینہ سڑک، ہاتھ لکڑی کے جنگلے گزرتے ہیں جن پر ٹرک، ریل، موٹر، بسیں، بیل گاڑی
مگر اب یہ محسوس ہوتا ہے مجھ کو کہ کچھ دن سے پانی مجھے کاٹتا ہے زمیں اپنے اندر ہی دھنستی چلی جا رہی ہے،

مرا آنچل کا سایہ، کھلے آنگنوں، اونچی دیوار و در، چھت، شجر اور پہاڑوں سے ہوتا خلا کا مکیں ہو رہا ہوں
طلب بھی کہ اس پھیلتے اور سمٹتے بدن کو میں بانہوں میں بھر لوں مگر دھوپ کیسی سرکتی چلی جا رہی ہے

صبح کا جھرنا ہمیشہ ہنسنے والی عورتیں
جھٹپٹے کی ندیاں، خاموش گہری عورتیں

معتدل کر دیتی ہیں یہ سرد موسم کا مزاج
برف کے ٹیلوں پہ چڑھتی دھوپ جیسی عورتیں

سبز، نارنجی، سنہری، کھٹی، میٹھی لڑکیاں
بھاری جسموں والی ٹپکے آم جیسی عورتیں

سڑکوں، بازاروں، مکانوں، دفتروں میں رات دن
لال، پیلی، سبز، نیلی، جلتی بجھتی عورتیں

شہر میں اک باغ ہے اور باغ میں تالاب ہے
تیرتی ہیں اس میں ساتوں رنگ والی عورتیں

سیکڑوں ایسی دکانیں ہیں جہاں مل جائیں گی
دھات کی، پتھر کی، شیشے کی ربڑ کی عورتیں

منجمد ہیں برف میں کچھ آگ کے پیکر ابھی
مقبروں کی چادروں میں ہیں پھول جیسی عورتیں

ان کے اندر پک رہا ہے وقت کا آتش فشاں
کن پہاڑوں کو ڈھکے ہیں برف جیسی عورتیں

آنسوؤں کی طرح تارے گر رہے ہیں عرش سے
رو رہی ہیں آسمانوں کی اکیلی عورتیں

غور سے سورج نکلتے وقت دیکھو آسماں
چومتی ہیں کس کا ماتھا اجلی لمبی عورتیں

فاختائیں، تتلیاں، مچھلی، گلہری، بلیاں
زندگی میں آئیں اپنی کیسی کیسی عورتیں

سبز سونے کے پہاڑوں پر قطار اندر قطار
سر سے سر جوڑے کھڑی ہیں لانبی لانبی عورتیں

ایمیج

اک غزل میں سیکڑوں افسانے نظمیں اور گیت
اس سراپے میں چھپی ہیں کیسی کیسی عورتیں

واقعی دونوں بہت مظلوم ہیں نقاد اور
ماں کہے جانے کی حسرت میں سلگتی عورتیں

--

چل مسافر، بتیاں جلنے لگیں
آسمانی گھنٹیاں بجنے لگیں

کھل رہا ہے شام کا کالا گلاب
زرد سوکھی پتیاں جھڑنے لگیں

سرخ، دھانی، سبز، نیلی، دودھیا
شام آئی بتیاں جلنے لگیں

دن کے سارے کپڑے ڈھیلے ہو گئے
رات کی سب چولیاں کسنے لگیں

رات اک تالاب کے آئینے میں
جھلملاتی کشتیاں چلنے لگیں

[ڈوب جائیں گے سبھی دریا، پہاڑ
چاندنی کی ندیاں چڑھنے لگیں]

بند کر لو در، دریچے، کھڑکیاں
پھر ہوا میں سیٹیاں بجنے لگیں

جامنوں کے باغ پر چھائی گھٹا
اودی اودی لڑکیاں ہنسنے لگیں

شاخ تھی کمزور شاید اس لیے
پتیوں پر پتیاں مرنے لگیں

رات کی تنہائیوں کو سوچ کر
چائے کی دو پیالیاں ہنسنے لگیں

لان میں طیارے پھر اُڑنے لگے
سُرخ، نیلی گاڑیاں چلنے لگیں

دوڑتے ہیں پھول، بستوں کو دبائے
پاؤں پاؤں تتلیاں چلنے لگیں

--

لہو پکارتا ہے روشنی کے پیکر دے
زمینیں چیخ رہی ہیں ہمیں پیمبر دے

یہ آب سیدھا چلا جا رہا ہے بڑھتا ہوا
کوئی چٹان بے سینہ سامنے کر دے

کہاں سے ذہن میں اک دم مرے خیال آیا
گلاس خالی ہے اس میں کوئی لہو بھر دے

ذرا سا سر ہے مگر اس میں ایک صحرا ہے
اسی طرح مری آواز کو سمندر دے

تمام تاروں کو چھوتا ہوا گزر جاؤں
کمان بن کے مجھے تیر سا رواں کر دے

یہ اب کی خود پہ گرا کر شہید ہو جائیں
خلا میں بھی ابابیلوں کو وہ پتھر دے

اندھیرے کمرے میں سب لوگ اب برہنہ ہیں
کسی کا ہاتھ بڑھے اور روشنی کر دے

کھلے سے لان میں سب لوگ بیٹھیں چائے پئیں
دعا کرو کہ خدا ہم کو آدمی کر دے

-- --

اپنی اُداس دھوپ تو گھر گھر چلی گئی
یہ روشنی لکیر کے باہر چلی گئی

نیلا سفید کوٹ زمیں پر بچھا دیا
وہ اپنی سرخ کار کی چھت پر چلی گئی

میں نیچے زرد گھاس کے بستر پہ سو گیا
وہ اپنی سرخ کار کی چھت پر چلی گئی

کب تک جھلستی ریت پہ چلتی تمھارے ساتھ
دریا کی موج دریا کے اندر چلی گئی

ہم لوگ اونچے پول کے نیچے کھڑے رہے
اُلٹا تھا بلب روشنی اندر چلی گئی

لہروں نے گھیر رکھا تھا سارے مکان کو
مچھلی کدھر سے کمرے کے اندر چلی گئی

اپنی جگہ جمے ہیں کہنے کو کہہ رہے تھے
سب لوگ ورنہ بہتے دریا میں بہہ رہے تھے

ایسا لگا کہ ہم تم گہرے میں چل رہے ہوں
دو پھول اونچی نیچی لہروں پہ بہہ رہے تھے

دل اُجلے پاک پھولوں سے بھر دیا تھا کس نے
اُس دن ہماری آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے

اکثر شراب پی کر پڑھتی تھی وہ دُعائیں
ہم ایک ایسی لڑکی کے ساتھ رہ رہے تھے

اخبار میں تو ایسی کوئی خبر نہیں تھی
جلتے مکان جھوٹے افسانے کہہ رہے تھے

--

ہوا میں ڈھونڈھ رہی ہے کوئی صدا مجھ کو
پکارتا ہے پہاڑوں کا سلسلہ مجھ کو

میں آسمان و زمیں کی حدیں ملا دیتا
کوئی ستارہ اگر جھک کے چومتا مجھ کو

چپک گئے مرے تلووں سے پھول شیشے کے
زمانہ کھینچ رہا تھا برہنہ پا مجھ کو

وہ شہسوار بڑا رحم دل تھا میرے لیے
بڑھا کے نیزہ زمیں سے اٹھا لیا مجھ کو

مکان، کھیت، سبھی آگ کی لپیٹ میں تھے
سنہری گھاس میں اس نے چھپا دیا مجھ کو

دبیز ہونے لگی سبز کائی کی چادر
نہ چوم پائے گی اب سرپھری ہوا مجھ کو

پلا کے رات کا رس رات شش بناتی تھی
سویرے لوگوں سے کہتی تھی دیوتا مجھ کو

تو ایک ہاتھ میں لے آگ ایک میں پانی
تمام رات ہوا میں جلا بجھا مجھ کو

بس ایک رات میں سرسبز یہ زمین ہوئی
مرے خدا نے کہاں تک بچھا دیا مجھ کو

– –

دہکتے نیزوں سے یہ رات حملہ کر دے گی
سجا کے چاند کی کشتی میں میرا سر دے گی

چڑھے گا سوکھے بدن میں لہو کا فوّارہ
یہ سُرخ چاندنی، خالی گلاس بھر دے گی

تھرکتی مچھلی، نکل کر سر کٹے کپڑوں سے
تمام رات کو اب بے لباس کر دے گی

یہ نرم بلّی جو سوئی ہے میرے سینے پر
میں سو گیا تو کلیجہ ہی چاک کر دے گی

اسی خیال سے تیرے ہیں گہرے پانی میں
کوئی تو موج، گہر کی اُسے خبر دے گی

بہار اب کے لہو کے چڑھے سمندر کو
قلم کیے ہوئے بازو، بُریدہ سر دے گی

بدن کے پیڑ کو خود اس کی شاخ کاٹے گی
یہی تراشِ زمیں کو نیا شجر دے گی

طواف، دائرے کا پہلی بار ٹوٹا ہے
یہ رہ گزر ہمیں اک اور رہ گزر دے گی

چڑھا کے پیٹھ پہ بجری کے بچے گھومیں گے
یہ دنیا اب ہمیں سرکس کا شیر کر دے گی

--

ماٹی کی کچی گاگر کو کیا کھونا، کیا پانا، بابا
ماٹی کو ماٹی رہنا ہے ماٹی میں مل جانا، بابا

ہم کیا جانیں دیواروں سے کیسے دھوپ اُترتی ہوگی
رات رہے باہر جانا ہے رات گئے گھر آنا، بابا

جس لکڑی کو اندر اندر دیمک بالکل چاٹ چکی ہو
اس کو اوپر سے چمکانا راکھ پہ دھوپ جمانا، بابا

چھت کے اوپر بادل برسیں، چھت کے نیچے اپنی آنکھیں
تن کی اس گیلی مٹی کو گھل گھل کر بہہ جانا، بابا

پیار کی گہری جھنکاروں سے سارا بدن آکاش ہوا ہے
دودھ پلانا، تن ڈسوانا ہے دستور پرانا، بابا

اِن اونچے شہروں میں پیدل صرف دیہاتی ہی چلتے ہیں
ہم کو بازاروں سے اک دن کاندھے پر لے جانا، بابا

پانی کے ہم جھوٹے موتی کیسے پلکوں پر رک جائیں
ندّی کو دریا، دریا کو ساگر سے مِل جانا، بابا

دھوپ نئی بیل باٹم پہنے سڑکوں کی کشتی پر تیرے
راکھ کا کرتا، دھول کی لُنگی، اپنا بھیس پرانا، بابا

— —

چاند ہاتھ میں بھر کر، جگنوؤں کے سر کاٹو اور آگ پر رکھ دو
موم بتّی کی رانیں جب بلیڈ سے کھل جائیں چاقوؤں کے سر رکھ دو

میں بھی اک شجر ہی ہوں جس پہ آج تک شاید پھول پھل نہیں آئے
تم مری ہتھیلی پر ایک رات چپکے سے برف کے ثمر رکھ دو

دھوپ کا ہی ابجرا، آگ کے سمندر میں چل پڑا ہمیں لینے
نرم و گرم ہونٹوں سے بند ہوتی پلکوں پر تتلیوں کے پر رکھ دو

چاہے کوئی موسم ہو دن گئی بہاروں کے پھر سے لوٹ آئیں گے
ایک پھول کی پتی اپنے ہونٹ پر رکھ کر میرے ہونٹ پر رکھ دو

میرا تن درختوں میں اس لیے جھلستا ہے سخت دھوپ سہتا ہے
کیا عجب تم آنکلو اور میرے کاندھوں پر تھک کے اپنا سر رکھ دو

روز تار کٹنے سے رات کے سمندر میں شہر ڈوب جاتا ہے
اس لیے ضروری ہے اک دیا جلا کر تم دل کے طاق پر رکھ دو

--

زمیں سے آنچ زمیں توڑ کر نکلتی ہے
عجیب تشنگی ان بادلوں سے برسی ہے

مری نگاہ مخاطب سے بات کرتے ہوئے
تمام جسم کے کپڑے اُتار لیتی ہے

ہمارے عہد میں نایاب ہے بچائے رہو
تمھاری آنکھ میں اک چیز جو چمکتی ہے

سروں پہ دھوپ کی گٹھری اُٹھائے پھرتے ہیں
دلوں میں جن کے بڑی سرد رات ہوتی ہے

کھڑے کھڑے میں سفر کر رہا ہوں برسوں سے
زمین پاؤں کے نیچے کہاں ٹھہرتی ہے

ہوا ہمارے ہی سینے میں آئے جائے ہے
بلند چاند ستارے زمین گھری ہے

بکھر رہی ہے مری رات اس کے شانوں پر
کسی کی صبح مرے بازوؤں میں سوتی ہے

پگھل رہی ہیں چٹانیں نحیف باہنوں میں
بدن میں پیار کے کیسی عجیب گرمی ہے

ہوا کے آنکھ نہیں، ہاتھ اور پاؤں نہیں
اسی لیے وہ سبھی راستوں پہ چلتی ہے

--

سب آنے والے بہلا کر چلے گئے
آنکھوں پر شیشے چمکا کر چلے گئے

بلبے کے نیچے آکر معلوم ہوا
سب کیسے دیوار گرا کر چلے گئے

اگر کبھی لوٹیں گے راکھ بٹوریں گے
جنگل میں جو آگ لگا کر چلے گئے

میں تھا۔ دن تھا اور اک لمبا رستہ تھا
سب خیمے جب لوگ اٹھا کر چلے گئے

چٹانوں پر آکر ٹھہرے دو رستے
پھر آگے اک راہ بنا کر چلے گئے

برف میں رکھی ٹھنڈی بوتل چیک گئی
خوف دلوں میں لوگ دبا کر چلے گئے

جب دو نالی نے رُخ پھیرا سب غازی
اپنے اپنے ہاتھ اُٹھا کر چلے گئے

جانے کب ڈونگوں میں بہکیں گے تارے
کتنے سورج ہاتھ دُھلا کر چلے گئے

گارے، چونے، پتھر کے دشمن دیکھو
آہن کی دیوار بنا کر چلے گئے

پتھر جیسے مچھلی کے کولھے چمکے
گنگا جل میں آگ لگا کر چلے گئے

سات ستارے اُڑتے گھوڑوں پر آئے
پلکوں سے کچھ پھول چرا کر چلے گئے

دیواریں۔ دیواروں کی جانب سرکیں
چھت سے بستر لوگ اُٹھا کر چلے گئے

کچھ ایسے بچّے بھی آئے مکتب میں
نام لِکھایا نام لِکھا کر چلے گئے

تتلی بھاگے تتلی کے پیچھے پیچھے
پھول آئے اور پھول چڑا کر چلے گئے

وہ چہرے کیسے تھے جو آوازوں سے
ان آنکھوں کو دھوپ دکھا کر چلے گئے

سردی آئی لوگ پہاڑوں کو بھولے
پتھر پر شیشے بکھرا کر چلے گئے

رات ہوا کے ایسے جھونکے در آئے
بھری ہوئی چھاگل چھلکا کر چلے گئے

--

دھوپ آتی ہے مجھ کو پھیلانے
شامیانہ مرا، ہوا تانے
پتّے، موتی، ہتھیلیوں پہ لیے
صبح کو دے رہے ہیں نذرانے
جھومتے پھول، مانگتے ہیں دُعا
اب ہوا آئے ہم کو بکھرانے
دھوپ کے اونچے نیچے رستوں کو
ایک کمرے کا بلب کیا جانے
ہاتھ کو ہاتھ چھو نہیں سکتے
انگلیوں کا نصیب دستانے
تیز پہیوں کی دھول میں ڈوبے
پیڑ تھک کر کھڑے ہیں سستانے

مچھلیاں ٹوٹتی ہیں کاروں پر
گھوڑے، اسکوٹروں کے دیوانے
اُجلے جوڑے، نفیس سُوٹوں میں
اچھے لگتے ہیں، جیسے افسانے

بلّیاں، کرسیوں پہ آ بیٹھیں
زنگ آلود، پیچے کھنکانے
پھر ہوا میں گلاس لہرائے
دو ستارے اُٹھے ہیں ٹکرانے
رات، بالکل برہنہ لیٹی ہے
بکھرے ہیں چاند تاروں کے دانے

آخری وقت، جب گزرنے لگوں
کچھ بھی میری نظر نہ پہچانے
ایک چڑیا ہے اس کو لے آنا
میرے کانوں میں گیت ٹپکانے
میں اُسے طرح طرح دیکھوں گا
بند آنکھیں سُنیں گی وہ گانے

--

رات کی بدلیاں بکھرنے لگیں
برف کی چوٹیاں چمکنے لگیں

ریت میں آگ دفن ہے شاید
منجمد مچھلیاں پگھلنے لگیں

پھر یہ گلزار ہو نہ جائے کہیں
آگ میں تتلیاں چمکنے لگیں

تلخیوں کی زبان پر اک رات
برف کی ٹافیاں پگھلنے لگیں

بارکوں میں پہ چہل پہل ہے بہت
وردیاں ، بیٹیاں چمکنے لگیں

آہستہ آہستہ دل پر دستک دو
دھیرے دھیرے یہ دروازہ کھلتا ہے

سورج کے گھر سے اُس کے گھر تک جانا
کتنا سیدھا سادا دھوپ کا رستہ ہے

جسم سویرا ہوتے ہوتے راکھ ہوا
لیکن دایاں ہاتھ ابھی تک سونا ہے

شعلوں کے کپڑے مچھلی نے پھینک دیے
سُرخ شیڈ میں زہر کا جسم دمکتا ہے

--

ایسی گڈمڈ ہوئیں سردیاں، گرمیاں
آگ کی سسکیوں میں کھلی قلفیاں

دھوپ میں سرخ تارے چمکنے لگے
پکّے امرود پر پڑ گئیں چھتّیاں

صبح کی پسلیوں سے نکلنے لگیں
کرنیں باندھے ہوئے رنگ کی لنگیاں

آگ کی تتلیوں کو اگر چھو لیا
راکھ ہو جائے گا لکڑیوں کا مکاں

رات کے ساتھ رات لیٹی تھی
صبح اک پالنے میں روتی تھی

یاد کی برف پوش ٹہنی پر
اک گلہری اُداس بیٹھی ہے

ناصر کی صدائے بازگشت

برف کی پیالیوں میں میٹھا دودھ
بے حسی روز پیتی رہتی ہے

ایک چُپ میرے اور اس کے بیچ
رات دیوار بن کے لیٹی تھی

میں یہ سمجھا کہ لوٹ آئے تم
دھوپ کل اتنی اُجلی اُجلی تھی

کتنے شاداب کتنے دلکش تھے
جب ندی روز ہم سے ملتی تھی

ایک کرتے کے بائیں کاندھے پر
پیار کی سُرخ تتلی بیٹھی تھی

کتنی ہلکی قمیص پہنے ہوئے
صبح انگڑائی لیتے اُٹھی تھی

رنگ سارے اٹیچیوں میں گئے
دھوپ میں آنگنی اکیلی تھی

بہتے پانی میں ایک کاغذ پر
روشنائی سی پھیلی پھیلی تھی

توڑ کے بے شمار کر ڈالا
یہ اکائی بہت اکیلی تھی

چھوڑ کر پھول، پیڑ پتوں کو
کس لیے تارسے وہ چپکی تھی

لوگوں نے غالباً نہیں دیکھا
دھوپ میں ایک شمع جلتی تھی

--

سُرمہ، مسّی، کنگھی، چوٹی، بھولی ہے
سوکھے پتّوں پر جو مینا بیٹھی ہے

کُہرے کے لرزیدہ ہاتھوں میں اکثر
تلسی اور ادرک کی چائے چھلکتی ہے

ساون نے دھرتی پر پھیلا دیں آنکھیں
لیکن میرا چہرہ اب بھی خالی ہے

وہ جو رنگ چمکتا ہے اس ٹہنی پر
ہاتھ آئے تو پھول نہیں تو تتلی ہے

شاور کے نیچے گھلتی جاتی ہے شام
میری آنکھوں پر اک ٹاول لپٹی ہے

تیر رہی ہے آگ کی مچھلی سینے میں
تم سمجھے تھے شاید برف کی برفی ہے

اپنے ہی مرچے، پودینے سوکھ گئے
ورنہ دنیا پاشِش کی دال تو اب بھی ہے

گُڑ کے لڈو پیڑے گندے بچے کھائیں
رانی بلی، دودھ جلیبی کھاتی ہے

اپنا ٹیپ بجا کر کوّا سنتا ہے
سب کو اپنی بولی اچھی لگتی ہے

عیب پرانے گھر کا یہ ہی ہے بابا
آئے نہ آئے کوئی، گھنٹی بجتی ہے

اس سنسان سی شام میں اونچے ٹیلے پر
زلفیں کھولے وہ لڑکی کیوں بیٹھی ہے

تین سمندر۔ دو صحرا۔ اس کے آگے
ناگن جیسی ایک لکیر چمکتی ہے

— —

یاد اب خود کو آ رہے ہیں ہم
کچھ دنوں تک خدا رہے ہیں ہم

آرزوؤں کے سرخ پھولوں سے
دل کی بستی سجا رہے ہیں ہم

آج تو اپنی خامشی میں بھی
تیری آواز پا رہے ہیں ہم

بات کیا ہے کہ پھر زمانے کو
یاد رہ رہ کے آ رہے ہیں ہم

جو کبھی لوٹ کر نہیں آتے
وہ زمانے بلا رہے ہیں ہم

زندگی اب تو سادگی سے مل
بعد صدیوں کے آ رہے ہیں ہم
اب ہمیں دیکھ بھی نہ پاؤ گے
اتنے نزدیک آ رہے ہیں ہم

غزلیں اب تک شراب پیتی تھیں
نیم کا رس پلا رہے ہیں ہم
دھوپ نکلی ہے مدتوں کے بعد
گیلے جذبے سکھا رہے ہیں ہم
فکر کی بے لباس شاخوں پر
فن کی پتی لگا رہے ہیں ہم
سردیوں میں لحاف سے چمٹے
چاند تاروں پہ جا رہے ہیں ہم
زیست کی ایک برقی لڑکی کو
"نورنامہ" پڑھا رہے ہیں ہم

اس نے پوچھا ہمارے گھر کا پتہ
کافی ہاؤس بلا رہے ہیں ہم
کندھے اچکا کے بات کہنے میں
منفرد ہوتے جا رہے ہیں ہم

چیت کپڑوں میں جسم جاگ پڑے
روح و دل کو سلا رہے ہیں ہم

کوئی شعلہ ہے کوئی جلتی آگ
جل رہے ہیں جلا رہے ہیں ہم

ٹیڑھی تہذیب، ٹیڑھی فکر و نظر
ٹیڑھی غزلیں، سنا رہے ہیں ہم

(۱۹۶۰-۶۱ء)

--

ہم سے مسافروں کا سفر، انتظار ہے
سب کھڑکیوں کے سامنے لمبی قطار ہے

چمکیلی سبز آنکھیں بہت دور جا چکیں
کن گھنٹیوں کا راستوں کو انتظار ہے

بانسوں کے جنگلوں میں وہی تیز بُو ملی
جن کا ہماری بستیوں میں کاروبار ہے

آواز پھڑپھڑا کے وہیں دفن ہو گئی
سینے میں غالباً کوئی بجلی کا تار ہے

سورج بریدہ سر ہے زمیں کے شہید کا
یہ دھوپ اس کے زرد بدن کی بہار ہے

غبارہ پھٹ رہا ہے ہواؤں کے زور سے
دنیا کو اپنی موت کا اب انتظار ہے

جھانکا حقیر قطرے نے نیزے کی نوک سے
نیچے سیاہ رات کا بے انت غبار ہے

کس روشنی کے شہر سے گزرے ہیں تیز رَو
نیلے سمندروں پہ سنہرا غبار ہے

آئی ندا، وہ اڑتے ستارے ادھر مڑے
ان بدلیوں کے پیچھے کوئی کوہسار ہے

--

مرا کیا کہیں بھی چلا جاؤں گا
مگر راستہ تو بنا جاؤں گا

اگر بارشیں آ گئیں راہ میں
سمندر کی تہہ میں اتر جاؤں گا

اگر مجھ کو کرنوں کے نیزے لگے
میں کیسے کو کچھ چھپا جاؤں گا

اگر بوڑھے کمرے کی بتی بجھی
میں خونخوار بلّی کو کھا جاؤں گا

اگر چاند ہر سال آتے رہے
تو میں چاند ہی پر چلا جاؤں گا

یہاں دوسرا کوئی بستر نہیں
تو کیا میں تمھیں کوئی کھا جاؤں گا

چمکتے چاند ستاروں کو اور کیا دوگے
ان آئینوں میں کبھی بدلیاں چھپا دوگے

سمندروں پہ لہو نے کہانیاں لکھ دیں
تم ان کو برف کے اوراق میں دبا دوگے

اداسیوں میں مجھے رات بھر جلاؤ گے
مسرتوں میں سرِ شام ہی بجھا دوگے

میں رات روک لوں اتنی مری بساط نہیں
سنہری پٹریاں رستوں پہ تم بچھا دوگے

برس پڑیں گے بھرے بادلوں کے طبالے
کوئی ستارہ اگر پھول میں چھپا دوگے

تمام رات یہ اسٹیشنوں پہ بھٹکیں گے
ہرے درختوں سے پنچھی اگر اُڑا دو گے

کسے خبر تھی درختوں پہ سایہ کرنے کو
گلوں کی رنگ بھری چھتریاں لگا دو گے

گلابی جھیل میں نیلے ستارے تیریں گے
اگر بدن کی سبھی بتیاں بجھا دو گے

تمھاری بستیاں پانی میں ڈوب جائیں گی
سمندروں کی اگر تشنگی بڑھا دو گے

--

اس زخمی پیاسے کو اس طرح پلا دینا
پانی سے بھرا شیشہ پتھر پہ گرا دینا

ان پتوں نے گرمی بھر سائے میں ہمیں رکھا
اب ٹوٹ کے گرتے ہیں بہتر ہے جلا دینا

چھوٹے قد و قامت پہ ممکن ہے ہنسے جنگل
اک پیڑ بہت لمبا ہے اس کو گرا دینا

ممکن ہے کہ اس طرح وحشت میں کمی آئے
خوابیدہ پرندوں پر اک گولی چلا دینا

اب دوسروں کی خوشیاں چبھنے لگیں آنکھوں میں
یہ بلب بہت روشن ہے اس کو بجھا دینا

باریک کفن پہنے تم چھت پہ چلی جاؤ
جب بھیڑ سی لگ جائے یہ پردہ اٹھا دینا

وہ جیسے ہی داخل ہو سینے سے مرے لگ کر
تم کوٹ کے کالر پر اک پھول لگا دینا

اس بدمزہ چائے میں سب ذائقے پائیں گے
اک سونے کے چمچے کو ہر کپ میں چلا دینا

— —

ہمارا درد ہماری دُکھی نوا سے لڑے
سُلگتی آگ کبھی سرپھری ہوا سے لڑے

میں جانتا ہوں کہ انجام کار کیا ہوگا
اکیلا پتہ اگر رات بھر ہوا سے لڑے

سمجھنا بادلوں میں گھر گیا ہے میرا جہاز
لہو میں تر کوئی طائر اگر ہوا سے لڑے

مرے عزیز مجھے قتل کر کے پھینک آتے
بھلا ہوا کہ مرے لب مری صدا سے لڑے

سنہری مچھلیاں بادل میں کوند جاتی ہیں
بدن وہی ہے جو بندش میں بھی قبا سے لڑے

سیاہ برف میں ٹھٹھری ہے کائنات مری
کوئی ستارہ اٹھے ٹوٹ کر خلا سے لڑے

تمام رات کی خونریز جنگ کا حاصل
بہت اندھیرا تھا اپنے ہی دست و پا سے لڑے

تمھارے شہر میں کیا ہو گیا تھا جس کے لیے
بشیر روتے رہے رات بھر خدا سے لڑے

--

صوفے، مسہری، کنگھی، بھورا لحاف ہے
لیکن ہر ایک شے پہ سُنہرا غلاف ہے

سینے سے لگ کے کاٹتا رہتا ہے رات دن
دریا کا نرم مٹّی سے کیا اختلاف ہے

دشمن، نہ کوئی فوج، نہ گھوڑے نہ شہسوار
خود سے لڑا یا کہ آج تو میدان صاف ہے

ساحل کی تشنہ ریت پہ جو مہرباں ہوئی
دریا بھی ایسی موج کے بے حد خلاف ہے

ایسا ملو کہ اپنا سمجھتا رہے صدا
جس شخص سے تمھارا دلی اختلاف ہے

اپنے پہاڑ، غیروں کے گل زار ہو گئے
یہ بھی ہماری راہ کی دیوار ہو گئے

پھل پک چکا ہے شاخ پہ گرمی کی دھوپ میں
ہم اپنے دل کی آگ میں تیار ہو گئے

ہم پھیلے نرم پتّوں کی اک شاخ تھے مگر
کاٹے گئے ہیں اتنے کہ تلوار ہو گئے

بازار میں بکی ہوئی چیزوں کی مانگ ہے
ہم اس لیے خود اپنے خریدار ہو گئے

تازہ لہو بھرا تھا سنہرے گلاب میں
انکار کرنے والے گنہگار ہو گئے

وہ سرکشوں کے پاؤں کی زنجیر تھے کبھی
اب بزدلوں کے ہاتھ میں تلوار ہو گئے

پروں میں نور ہے، پرواز میں حرارت ہے
لہو ہوا میں کسی صبح کی شہادت ہے

کسی کا پیار مجھے دیر تک نہ روک سکا
مرے بدن پہ ہوا کی کوئی علامت ہے

فضا میں دھنکی ہوئی روئی کے جزیرے ملے
کہاں کہاں مرے احساس کی لطافت ہے

سفید برف کے خرگوش گدگدانے لگے
لطیف سردیوں میں نرم نرم حدّت ہے

رگوں میں سیکڑوں برفیلی سوئیاں اتریں
مگر لہو میں ابھی تک وہی تمازت ہے

میں اپنے ہاتھ میں اپنا بریدہ سر لے کر
بہ غور دیکھوں مری واقعی جو صورت ہے

سیاہ سانپ کے سر پر سفید پھول کھِلا
روایتوں میں بڑی پیچ دار جدّت ہے

صدا کی دھوپ نہ چمکے تو گھر اُجڑ جائے
وشال مندروں میں گھنٹیوں سے عظمت ہے

--

آنکھوں میں مسکراتی ہوئی نرم دھوپ سے
کس طرح سرد برف کے پتھر پگھل گئے

ہم کو دعائیں دیتے تھے باہم یونہی ملو
شاخوں پہ اُجلے اُجلے فرشتے کھلے ہوئے

میں گھر سے جب چلا تو کواڑوں کی اوٹ میں
نرگس کے پھول چاند کی باہوں میں چھپ گئے

اس کی طرف چلا تھا کہ رستے میں بار بار
شیشے کی ٹوٹی گڑیا کے ٹکڑے پڑے ملے

سب سو رہے ہیں، چاند بہت پاس آگیا
ڈرتا ہوں کوئی چھت پہ کھڑا ہو کے چھو نہ لے

جنگل میں ایک پیڑ سے آئی صدا، رکو
ہم لوگ جا رہے تھے یونہی، گھومتے ہوئے

کئی درختوں نے ایسا زمیں کو چھوڑ دیا
کہ جیسے واقعی ان کو لیے پھرے گی ہوا

کبھی جو دوسری جھیلوں کی سمت پیاس بڑھی
ہمارے سینے میں کوئی پرندہ چیخ پڑا

پھر اسکے بعد ابھی تک مجھے زمیں نہ ملی
ذرا سی عمر تھی جب تنہا پہلی بار اُڑا

بدن دکھائی نہ دے کیسی خوش لباسی ہے
یہ کیا دیا کہ غریبی کا بانکپن بھی گیا

مشینیں چل رہی ہیں کوٹ بینٹ پہنے ہوئے
کسی کا نام محبت، کسی کا نام وفا

ہم کو بھی اپنی موت کا پورا یقین ہے
پر دشمنوں کے ملک میں اک مہ جبین ہے

سر پر کھڑے ہیں، چاند ستارے بہت مگر
انسان کا جو بوجھ اٹھا لے زمین ہے

یہ آخری چراغ اُسی کو بجھانے دو
اس بستی میں وہ سب سے زیادہ حسین ہے

تکیے کے نیچے رکھتا ہے تصویر کی کتاب
تحریر و گفتگو میں جو اتنا متین ہے

اشکوں کی طرح تھم گئیں جذبوں کی ناگنیں
بیدار میرے ہونٹوں پہ لفظوں کی بین ہے

یاروں نے جس پہ اپنی دکانیں سجائی ہیں
خوشبو بتا رہی ہے ہماری زمین ہے

تفصیل کیا بتائیں ہمارے بھی عہد میں
تعداد شاعروں کی وہی "پونے تین" ہے

--

گزارے ہم نے کئی سال ایسے دفتر میں
کنواری لڑکی رہے جیسے غیر کے گھر میں

خدا کا شکر ابھی تک ہے اپنے جسموں میں
وہ ایک فرق جو ہوتا ہے مادہ و نر میں

بہت سنبھال کے رکھا تھا نیک بیوی نے
ہوا چلی تو برادہ بکھر گیا گھر میں

مری نگاہ کسی دوسرے کو تکنے لگی
وہ لڑکی بیٹھ گئی جب مرے برابر میں

اسے پکارا تو آنگن کی مہندی بول پڑی
پکارتے ہو انھیں رات کو کہاں گھر میں

یہ آسمان زمیں کا بدن چھپائے گا
ستارے ٹوٹ کے گر جائیں گے سمندر میں

--

سانپ، جب اُس کا بدن چاٹے
ریت کو ریت کی جلن چاٹے

برف کی انگلیاں اگر چوموں
میرے تلووں کو اک کرن چاٹے

کس محبت سے چومتے ہو ہمیں
سانپ جس طرح اپنا من چاٹے

ایک لمحے کی روشنی کے لیے
آگ کاغذ کے پیرہن چاٹے

ایک ہزار ایک، رات کے تھن ہیں
جب یہ ناگن کسی کا تن چاٹے

مرد اس سمت دیکھتے ہی نہیں
گاڑے جب گائے کا بدن چاٹے

زرد کتے کی سرخ جیبھ کبھی
سرمئی رات کی تھکن چاٹے

ایک بلی سفید چوہے کا
دھوپ میں بیٹھ کر بدن چاٹے

ایک خرگوش برف پر لیٹا
اک گلہری کا سرد تن چاٹے

آئینہ خانے میں اکیلا سانپ
جھوم جھوم آج اپنا پھن چاٹے

دو منٹ میں کوکر کی سات ڈشیں
انگلیاں، اب غزل کا فن چاٹے

--

جب سحر چُپ ہو، ہنسا لو ہم کو
جب اندھیرا ہو جلا لو ہم کو

ہم حقیقت ہیں نظر آتے ہیں
داستانوں میں چھپا لو ہم کو

دن نہ پا جائے کہیں شب کا راز
صبح سے پہلے اُٹھا لو ہم کو

ہم زمانے کے ستائے ہیں بہت
اپنے سینے سے لگا لو ہم کو

وقت کے ہونٹ ہمیں چھو لیں گے
اَن کہے بول ہیں گا لو ہم کو

(۱۹۵۸ء)

--

وہ نہیں ہے تو اُس کی آس رہے
ایک جائے تو ایک پاس رہے

جب بھی کسنے لگا، اُتار دیا
اس بدن پر کئی لباس رہے

ایک دن میں اگر لہو پی لوں
سات دن برتنوں میں باس رہے

دونوں اک دوسرے کا منھ دیکھیں
آئینہ، آئینے کے پاس رہے

گھل گئے اپنی بدنصیبی میں
جو ستارے ہمارے پاس رہے

آج ہم سب کے ساتھ خوب ہنسے
اور پھر دیر تک اُداس رہے

--

پھول سا کچھ کلام اور سہی
اک غزل اس کے نام اور سہی

اس کی زلفیں بہت گھنیری ہیں
ایک شب کا قیام اور سہی

زندگی کے اداس قصے ہیں
ایک لڑکی کا نام اور سہی

کرسیوں کو سنائیے غزلیں
قتل کی ایک شام اور سہی

کپکپاتی ہے رات سینے میں
زہر کا ایک جام اور سہی

——

آیا ہی نہیں ہم کو آہستہ گزر جانا
شیشے کا مقدر ہے ٹکرا کے بکھر جانا

تاروں کی طرح شب کے سینے میں اتر جانا
آہٹ نہ ہو قدموں کی اس طرح گزر جانا

نشے میں سنبھلنے کا فن یوں ہی نہیں آیا
ان زلفوں سے سیکھا ہے لہرا کے سنور جانا

بھر جائیں گے آنکھوں میں آنچل سے بندھے بادل
یاد آئے گا جب گل پہ شبنم کا بکھر جانا

ہر موڑ پہ دو آنکھیں ہم سے یہی کہتی ہیں
جس طرح بھی ممکن ہو تم لوٹ کے گھر جانا

پتھر کو مرا سایہ آئینہ سا چمکا دے
جانا تو مرا شیشہ یوں درد سے بھر جانا

یہ چاند ستارے تم اوروں کے لیے رکھ لو
ہم کو یہیں جینا ہے ہم کو یہیں مر جانا

جب ٹوٹ گیا رشتہ سرسبز پہاڑوں سے
پھر تیز ہوا جانے ہم کو ہے کدھر جانا

--

ہر روز ہمیں ملنا ہے ہر روز بچھڑنا ہے
میں رات کی پرچھائیں تو صبح کا چہرا ہے

عالم کا یہ سب نقشہ بچوں کا گھروندا ہے
اک ذرّے کے قبضے میں سہمی ہوئی دنیا ہے

ہمراہ چلو میرے یا راہ سے ہٹ جاؤ
دیوار کے روکے سے دریا کہیں رکتا ہے

ان کے ہی اشاروں پر یہ رات ملی ہم کو
جن چاند سے چہروں کا سایہ بھی سنہرا ہے

سنّاٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذاتِ خود آواز کا صحرا ہے

اک گونج بھٹکتی ہے سنسان پہاڑوں میں
جب رات کے سینے میں دل میرا دھڑکتا ہے

کب جانے ہوا اس کو بکھرا دے فضاؤں میں
خاموش درختوں پر سہما ہوا نغمہ ہے

پلکوں کے مہ و انجم مٹی میں ملاتے ہو
شبنم کی پھواروں سے پتھر کہیں پگھلا ہے

--

جو ادھر سے جا رہا ہے وہی مجھ پہ مہرباں ہے
کبھی آگ پاسباں ہے کبھی دھوپ سائباں ہے

بڑی آرزو تھی مجھ سے کوئی خاک رو کے کہتی
اتر آ مری زمیں پر تو ہی میرا آسماں ہے

میں اسی گماں میں برسوں بڑا مطمئن رہا ہوں
ترا جسم بے تغیر، مرا پیار جاوداں ہے

کبھی سرخ مومی شمعیں وہاں پھر سے جل سکیں گی
وہ لکھوری اینٹوں والا جو بڑا سا اک مکاں ہے

سبھی برف کے مکانوں پہ کفن بچھے ہیں لیکن
یہ دھواں بتا رہا ہے ابھی آگ بھی یہاں ہے

کوئی آگ جیسے کہر میں دبی دبی سے چمکے
تری جھلملاتی آنکھوں میں عجیب سا سماں ہے

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

--

سائے اترے، پنچھی لوٹے، بادل بھی چھانے والا ہے
لیکن میں وہ ٹوٹا تارا جو گھر سے جانے والا ہے

پھر صبح ہوئی آنکھیں کھولیں، کپڑے بدلیں فیتے باندھیں
اس شہر کے بارے میں سوچیں جو شہر اب آنے والا ہے

کل شب اک ویران مسجد میں اس نے میرے آنسو پونچھے
جو ہم سب کی سوکھی شاخوں پر پھول کھلانے والا ہے

دل کے یہ دونوں دروازے کبھی نہیں بے نور ہوئے ہیں
صدیوں سے اس اجڑے گھر میں اک دیا جلانے والا ہے

میں وہ شبنم جو پھولوں کی آنکھوں میں رہے اور یہ سوچے
ایسا لگتا ہے جیسے اب سب ہاتھ سے جانے والا ہے

ہم ریت کے جلتے ذروں کو یہ دھوپ ہی چمکائے ورنہ
دریا کترانے والا ہے، بادل ترسانے والا ہے

جگنو چمکے تو میں چونکوں، تارا نکلے تو میں سہموں
جیسے ہر کوئی میرے گھر ہی آگ لگانے والا ہے

جس چھپر کے نیچے گاؤں کے بوڑھے حقّہ پیتے ہیں
اس چھت میں اک پاگل لڑکا اب آگ لگانے والا ہے

جس آئینے کو برسوں میں تم رکھّے پھرتے تھے ٹوٹ گیا
یہ دھوپ کا شیشہ آنکھوں پر نیزے چمکانے والا ہے

--

رات کے سمندر میں ڈوب گئی شام
میرے بھی سینے میں آئے مری شام

بادل تھے کمرے میں بکھرے پڑے
بستر پہ لیٹی تھی تھکی ہوئی شام

بند کیے بیٹھے تھے یادوں کا گھر ہم
دروازہ کھول کر چلی گئی شام

سارے بدن کا تناؤ فضا میں
کَسے کَسے کپڑوں میں پھنسی پھنسی شام

تاروں کی آنکھوں میں کرنوں کے نیزے
سورج کے سینے میں چبھی ہوئی شام

تھکے تھکے پیڈل کے بیچ چلے سورج
گھر کی طرف لوٹی دفتر کی شام

--

کہرے کے کمبل میں پول کپکپائے
دو بلب چشمے کے پیچھے تھرتھرائے

ہیٹر میں بجھی بجھی بیمار سرسوں
پانی تو پانی ہے کیسے کھول جائے

گھڑے سوکھ گئے پانی کے برتن
سویا ہوا نل دیکھو کب کنمنائے

چہرے پہ کیلے کے چھلکے کبھی ماریں
بلّے سے پہلے اگر گیند گھوم جائے

ساحل پہ مچھلی نے کپڑے اتارے
چڑھے ہوئے دریا کی دھار کہے ہائے

ہر سمت موٹر کی آنکھوں کے نیزے
جیسے مشینوں بیچ ہاتھ آ جائے

ہوا چلی لہروں سے لہریں لپٹ جائیں
موجوں کی چال پر کنگارے کٹ جائیں

بجلی کے دہکے ہوئے تاروں کو چھو لیں
کہو ریل گاڑی کے نیچے کٹ جائیں

چھوٹے سے ڈبّے میں اتنے مسافر
مل جل کے سب بیٹھیں آدھے سٹ جائیں

کتنے ہی تنہا کپاسی رنگ دھاگے
ریشم کی ڈوری کے ساتھ بٹ جائیں

اونچا اڑا کر ہم کو لڑا دو
چاہے اسے کاٹیں اور چاہے کٹ جائیں

کاہے کو بھاگو ہو سورج کے پیچھے
راتیں بھی ایسی جو لپیٹ لپیٹ جائیں

چکنے لحافوں میں ڈوب گئے تارے
ہم بھی پھٹی چادر کے ساتھ لپٹ جائیں

ٹھنڈی ہواؤں میں کیسی لپک ہے
پھولوں کے رنگ بھرے ہونٹ پھٹ جائیں

--

مجھے بھلائے کبھی یاد کر کے روئے بھی
وہ اپنے آپ کو بکھرائے اور پروئے بھی

شمار ہم نہ ہوئے اُن چمکنے والوں میں
بدن بھی ملتے رہے، روز کپڑے دھوئے بھی

بہت غبار بھرا تھا دلوں میں دونوں کے
مگر وہ ایک ہی بستر پہ رات سوئے بھی

بہت دنوں سے نہائے نہیں ہیں آنگن میں
کبھی تو راہ کی بارش ہمیں بھگوئے بھی

یہ تم سے کس نے کہا رات سے میں ڈرتا ہوں
ضرور آئے مرے بازوؤں میں سوئے بھی

وہ نوجوان جوانی کی نیند میں گم تھا
بہت پکارا، جھنجھوڑا، لپٹ کے رو دیے بھی

یقین جانیے احساس تک نہ ہوگا ہمیں
نسوں میں سوئیاں کوئی اگر چبھوئے بھی

شبنم ہوں ۔ سُرخ پھولوں پہ بکھرا ہوا ہوں میں
دل موم ۔ اور دھوپ میں بیٹھا ہوا ہوں میں

کچھ دیر بعد راکھ ملے گی تمھیں یہاں
لو بن کے اس چراغ سے لپٹا ہوا ہوں میں

دنیا ہے بے پناہ تو بھرپور زندگی
دو عورتوں کے بیچ میں لیٹا ہوا ہوں میں

جو ایک شیر خوار کے لب تر نہ کر سکے
ایسے سپاٹ سینے سے چمٹا ہوا ہوں میں

دو سخت خشک روٹیاں کب سے لیے ہوئے
پانی کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں میں

لا دی اُٹھا کے گھاٹ پہ جانے لگے ہرن
کیسے عجیب دور میں پیدا ہوا ہوں میں

خود میرا ہاتھ بھی نہ پہنچ پائے گا کبھی
اتنے بلند طاق پہ رکھا ہوا ہوں میں

اس کو ہی لوگ چوم کے فن کار ہو گئے
جس ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا ہوں میں

بہتر ہوں لوٹ جاؤں میں اپنی زمین پر
کس آس پر خلاؤں میں لٹکا ہوا ہوں میں

نس نس میں پھیل جاؤں گا بیمار رات کی
پلکوں پہ آج شام سے سمٹا ہوا ہوں میں

اوراق[1] میں چھپاتی تھی اکثر وہ تتلیاں
شاید کسی کتاب میں رکھا ہوا ہوں میں

---

[1] ـــــــ شہناز نے اس شعر میں یوں تخلیقی تحریف کی ہے۔
اوراق میں چھپاتا تھا اکثر وہ تتلیاں
شاید کسی کتاب میں رکھی ہوئی ہوں میں

سبزے میں انکسار و قناعت تلاش کر
گل ہوں ۔ اگرچہ شاخ سے ٹوٹا ہوا ہوں میں

دریاؤں اور نہروں کی سینچی ہوئی ہے وہ
چھت چھت ہزار بار کا برسا ہوں ہوں میں

گنبد ہوں اپنے عہد کی سنسان رات کا
تنہائیوں کی گونج سے گونجا ہوا ہوں میں

--

کوئی جاتا ہے یہاں سے، نہ کوئی آتا ہے
یہ دیا اپنے اندھیرے میں گھٹا جاتا ہے

سب سمجھتے ہیں وہی رات کی قسمت ہوگا
جو ستارہ کہ بلندی پہ نظر آتا ہے

بانڈ نگیں لوگ نہیں ہیں جو کہیں بھاگ سکیں
روز انسانوں کا سیلاب بڑھا جاتا ہے

میں اسی کھوج میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہوں
کس کا آنچل ہے جو کہساروں پہ لہراتا ہے

میری[۱] آنکھوں میں ہے اک ابر کا ٹکڑا شاید
کوئی موسم ہو سرِ شام برس جاتا ہے

دے تسلی کوئی تو آنکھ چھلک اٹھتی ہے
کوئی سمجھائے تو دل اور بھی بھر آتا ہے

ابر کے کھیت میں بجلی کی چمکتی ہوئی راہ
جانے والوں کے لیے راستہ بن جاتا ہے

--

[۱] آخر کے تین شعر ۵۸ء کے ہیں جو 'سویرا' لاہور میں چھپ چکے ہیں۔ یہ وضاحت اس لیے بھی ضروری تھی کہ جدید غزل میں "ابر کا ٹکڑا" بہت برسا۔

راکھ اُڑتی ہے اب ہلالوں پر
دھوپ تھی سیب جیسے گالوں پر

آگ، محفوظ رکھیے سینے میں
برف جمنے لگی ہے بالوں پر

پیس کر کس نے لیپ دی ہلدی
سبز موسم کے سرخ گالوں پر

پیڑ تو کٹ چکا۔ کہاں ہوں گے
جو جھکتے بہت تھے ڈالوں پر

تم بھی پک جاؤ گے ہماری طرح
ایک دن چار چھ جوانوں پر

جنگلی لڑکیوں نے جنگل میں
پھول کاڑھے ہیں سبز شانوں پر

ناف میں پھول ۔ ران پر مچھلی
تتلیاں سو رہی ہیں گالوں پر

صرف اک خواب تھی جدید غزل
ناز کر ہم سے بے کمالوں پر

--

ہر بے زبان گل میں چہکنے لگے ہیں ہم
پیسے گئے تو اور مہکنے لگے ہیں ہم

غربت بُرا نشہ ہے اسی کا اثر نہ ہو
اب بات بات پر جو بہکنے لگے ہیں ہم

مٹی کی باس اپنے بدن کی اسیر تھی
یہ تیرا قرب ہے کہ مہکنے لگے ہیں ہم

دنیا سمجھ رہی تھی کہ اب راکھ ہو چکے
کیسی ہوا چلا دی۔ دہکنے لگے ہیں ہم

جن کی زبانیں کٹ گئیں پھولوں کے نام پر
ان بلبلوں کی طرح چہکنے لگے ہیں ہم

— —

گلوں کی طرح ہم نے زندگی کو اس قدر جانا
کسی کی زلف میں اک رات سونا اور بکھر جانا

اگر ایسے گئے تو زندگی پر حرف آئے گا
ہواؤں سے لپٹنا ۔ تتلیوں کو چوم کر جانا

دھنک کے رکھ دیا تھا بادلوں کو جن پرندوں نے
انھیں کس نے سکھایا اپنے سائے سے بھی ڈر جانا

کہاں تک یہ دیا بیمار کمرے کی فضا بدلے
کبھی تم ایک مٹھی دھوپ ان طاقوں میں بھر جانا

اسی میں عافیت ہے گھر میں اپنے چین سے بیٹھو
کسی کی سمت جانا ہو تو رستے میں اتر جانا

--

قدم جمانا ہے اور سب کے ساتھ چلنا ہے
ہم اپنی راہ کا پتھر ہیں اور دریا بھی

مگر جو فاصلہ پہلے تھا اور بڑھتا گیا
میں اسکے پاس گیا وہ اِدھر سے گزرا بھی

بہت ذہین و زمانہ شناس تھا لیکن
وہ رات بچوں کی صورت لپٹ کے رویا بھی

یہ خشک شاخ نہ سرسبز ہو سکی اُس نے
مجھے گلے سے لگایا پلک سے چوما بھی

چراغ جلنے سے پہلے ہمیں پہنچنا ہے
ڈھکے ہوئے ہے پہاڑوں کو آج کہرا بھی

ہزاروں میل کا منظر ہے اس نگینے میں
ذرا سا آدمی دریا ہے اور صحرا بھی

وہی شرارہ کہ جس سے جھلس گئیں پلکیں
ستارہ بن کے مری رات میں وہ چمکا بھی

اثر وہی ہوا آخر اگرچہ پہلے پہل
ہوا کا ہاتھ گلوں کے بدن پہ پھسلا بھی

انھیں تو حفظ تھے سب اپنے لوگ نام بنام
ہمیں کو یاد نہ آیا کسی کا چہرہ بھی

ہم اپنا گھر بھی نہ اب ڈھونڈھ پائیں گے شاید
اگر ہمارا ہوا اس طرف کو پھیرا بھی

ابھی زمانے سے شاید ہو سو برس پیچھے
تمھارا دل بھی سلامت ہے اور چہرہ بھی

مگر جو فاصلہ پہلے تھا اور بڑھتا گیا
میں اسکے پاس گیا نہ ادھر سے گزرا بھی

--

چاند کا ٹکڑا نہ سورج کا نمائندہ ہوں
میں نہ اس بات پہ نازاں ہوں نہ شرمندہ ہوں

دفن ہو جائے گا جو سیکڑوں من مٹی میں
غالباً میں بھی اسی شہر کا باشندہ ہوں

زندگی تو مجھے پہچان نہ پائی لیکن
لوگ کہتے ہیں کہ میں تیرا نمائندہ ہوں

پھول سی قبر سے اکثر یہ صدا آتی ہے
کوئی کہتا ہے بچا لو میں ابھی زندہ ہوں

تن پہ کپڑے ہیں، قدامت کی علامت اور میں
سر برہنہ یہاں آجانے پہ شرمندہ ہوں

واقعی اس طرح میں نے کبھی سوچا ہی نہیں
کون ہے اپنا یہاں کس کے لیے زندہ ہوں

کسے خبر تھی تجھے اس طرح سجاؤں گا
زمانہ دیکھے گا اور میں نہ دیکھ پاؤں گا

حیات و موت فراق و وصال سب یکجا
میں ایک رات میں کتنے دیئے جلاؤں گا

پلا بڑھا ہوں ابھی تک انھیں اندھیروں میں
میں تیز دھوپ سے کیسے نظر ملاؤں گا

مرے مزاج کی یہ مادرانہ فطرت ہے
سویرے ساری اذیت میں بھول جاؤں گا

تم ایک پیڑ سے وابستہ ہو مگر میں تو
ہوا کے ساتھ بہت دُور دُور جاؤں گا

مرا یہ عہد ہے میں آج شام ہونے تک
جہاں سے رزق لکھا ہے وہیں سے لاؤں گا

--

کوئی نہ جان سکا وہ کہاں سے آیا تھا
اور اس نے دھوپ سے بادل کو کیوں ملایا تھا

یہ بات لوگوں کو شاید پسند آئی نہیں
مکان چھوٹا تھا لیکن بہت سجایا تھا

وہ اب وہاں ہے جہاں راستے نہیں جاتے
میں جس کے ساتھ یہاں پچھلے سال آیا تھا

سُنا ہے اس پہ چہکنے لگے پرندے بھی
وہ ایک پودا جو ہم نے کبھی لگایا تھا

چراغ ڈوب گئے کپکپائے ہونٹوں پہ
کسی کا ہاتھ ہمارے لبوں تک آیا تھا

بدن کو چھوڑ کے جانا ہے آسماں کی طرف
سمندروں نے ہمیں یہ سبق پڑھایا تھا

تمام عمر مرا دم اسی دھوئیں میں گھُٹا
وہ اک چراغ تھا میں نے اُسے بُجھایا تھا

— —

پانچ پیسے میں ایک قتل کرے
واقعی آج جس کو جینا ہے

پھر مری ہڈیاں پچھوڑے گا
آسماں کا جو زرد کتا ہے

یاد کے بلغمی بچھونے پر
گندگی کا وجود لیٹا ہے

ناگ اس چاندنی کے زینے پر
میرے بستر پہ روز آتا ہے

چونچ پتھر کی ہل نہیں سکتی
گھانس میں ایک سرخ کیڑا ہے

دن ڈھلا شام ہو گئی لیکن
سانپ دریا کے پاس بیٹھا ہے

سرخ شاخوں کے بیچ بائیں طرف
شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہے

--

ہماری شہرتوں کی موت بے نام و نشاں ہوگی
نہ کوئی تذکرہ ہوگا نہ کوئی داستاں ہوگی

اگر میں لوٹنا چاہوں تو کیا میں لوٹ سکتا ہوں
وہ دنیا ساتھ جو میرے چلی تھی اب کہاں ہوگی

پرندے اپنی منقاروں میں سب تارے چھپا لیں گے
جوانی چار دن کی چاندنی ہے پھر کہاں ہوگی

درختوں کی یہ چھالیں بھی اتر جائیں گی پتے کیا
یہ دنیا دھیرے دھیرے ایک دن پھر سے جواں ہوگی

ہوائیں روئیں گی بس سر پھوڑ لیں گی ان پہاڑوں سے
کبھی جب یاد لوں میں چاند کی ڈولی رواں ہوگی

کسے معلوم تھا ہم لوگ اک بستر پہ سوئیں گے
حفاظت کے لیے تلوار اپنے درمیاں ہوگی

پسینہ بند کمرے کی اُمس کا جذبہ ہے اس میں
ہمارے تولیے میں دھوپ کی خوشبو کہاں ہوگی

کسی گمنام پتھر پر بہت سے نام لکھ دو گے
تو قربانی ہماری اس طرح سے جاوداں ہوگی

زمینیں تو مرے اجداد نے ساری گنوادی ہیں
مگر یہ ایک مٹھی خاک خود اپنا نشاں ہوگی

سمندر بوڑھے ہو جائیں گے اور اک فاحشہ مچھلی
ہمارے ساحلوں اور جنگلوں کی حکمراں ہوگی

--

یہ چاندنی بھی جن کو چھوتے ہوئے ڈرتی ہے
دنیا اُنہی پھولوں کو پیروں سے مسلتی ہے

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشہ ہے
جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

لوبان میں چنگاری جیسے کوئی رکھ جائے
یوں یاد تری شب بھر سینے میں سُلگتی ہے

آجاتا ہے خود کھنچ کر دل سینے سے پٹری پر
جب رات کی سرحد سے اک ریل گزرتی ہے

آنسو کبھی پلکوں پر تا دیر نہیں رکتے
اُڑ جاتے ہیں یہ پنچھی جب شاخ لچکتی ہے

خوش رنگ پرندوں کے لوٹ آنے کے دن آئے
بچھڑے ہوئے ملتے ہیں جب برف پگھلتی ہے

——

پھول برسے کہیں شبنم کہیں گوہر برسے
اور اس دل کی طرف برسے تو پتھر برسے

بارشیں چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے
۱۹۵۹ء

ہم سے مجبور کا غصہ بھی عجب بادل ہے
اپنے ہی دل سے اٹھے اپنے ہی دل پر برسے

اب بھی محفوظ ہیں مٹی میں دفینے کتنے
رات پتھرائی ہوئی آنکھوں سے گوہر برسے

کون کہتا ہے کہ رنگوں کے فرشتے اتریں
جو بھی برسے مگر اس بار تو گھر گھر برسے
۱۹۷۳ء

سینے میں آگ، آگ میں آہن بھی چاہیے
رم جھم برستا باتوں سے ساون بھی چاہیے

تلوار توڑنے سے تلافی کہاں ہوئی
ان بزدلوں کے ہاتھ میں کنگن بھی چاہیے

سینے میں آفتاب سا اک دل ضرور ہو
ہر گھر میں ایک دھوپ کا آنگن بھی چاہیے

سورج خود اپنی آگ سے سورج ہے آج تک
انسان کے مزاج میں الجھن بھی چاہیے

اس فاحشہ زمیں کے لیے آسماں بنو
دنیا سمیٹ لینے کو دامن بھی چاہیے

کوئی فقیر ہوں جو کٹورہ لیے پھروں[1]
کھانے کے ساتھ کھانے کے برتن بھی چاہیے

---

[1] ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے (آتش)

یوں زندگی کے سینے سے آنچل نہ کھینچئے
سچائیوں میں جھوٹ کا کچھ فن بھی چاہیے

بچّوں کے ساتھ جھاڑیوں میں جگنو ڈھونڈھیے
دل کے معاملات میں بچپن بھی چاہیے

ہم آدمی ہیں یا کوئی بے حس چٹان ہیں
دل میں کسی کے نام کی دھڑکن بھی چاہیے

راہیں روایتوں کی اگر روندتے چلو
سر پر مجھے بزرگوں کا دامن بھی چاہیے

--

ان آنکھوں سے دن رات برسات ہوگی
اگر زندگی صرف جذبات ہوگی

مسافر ہو تم بھی، مسافر ہیں ہم بھی
کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

صداؤں کو الفاظ ملنے نہ پائیں
نہ بادل گھریں گے نہ برسات ہوگی

چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا
بڑی دور تک رات ہی رات ہوگی

ازل سے ابد تک سفر ہی سفر ہے
کہیں صبح ہوگی کہیں رات ہوگی

--

اِکائی

سے

بہتّر پتھر

اکائی سے بہتر پتھر

برف سی اُجلی پوشاک پہنے ہوئے پیڑ جیسے دُعاؤں میں مصروف ہوں
وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں آؤ سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا، بہتا ہوا پانی ہے

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

——— ۱۹۵۸ء

سجھائی کچھ نہیں دیتا شکستہ یادوں نے
کسی کا چہرہ کسی کے بدن میں جوڑ دیا

——— ۱۹۶۹ء

کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گزر گئے
جنھیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

دو بھٹکتی ہوئی روحیں جیسے ملیں، یوں ملیں وہ نگاہیں مگر خوف ہے
زیست ہے رات میں جنگلوں کا سفر، اس جنم میں بھی ہم کھو نہ جائیں کہیں

اک دریچے میں دو آنسوؤں کا سفر راستے کی طرح کھو گیا
نرم مٹی پہ گرتی ہوئی پتیاں، سونے والے کو چادر اڑھاتی رہیں

رونے والوں نے اٹھا رکھا تھا گھر سر پہ مگر
عمر بھر کا جاگنے والا پڑا سوتا رہا

یوں کسی کی آنکھوں میں صبح تک ابھی تھے ہم
جس طرح رہے شبنم پھول کے پیالوں میں

میری آنکھیں کسی کے آنسو ہیں
ورنہ ان پتھروں میں آب کہاں

اک معصوم سے پیار کا تحفہ گھر کے آنگن میں پایا تھا
اس کو غم کے پاگل پن میں کوٹھے کوٹھے بانٹ دیا

کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں
کہاں دن گزارا کہاں رات کی

پھول دوا جیسے مہکے ہیں
کسی بیمار کی صبح ہوئی ہے

جہاں پہ ملتی تھیں دو کرنیں اس شجر کے تلے
رضائی اوڑھے ہوئے اک فقیر بیٹھا ہے

سناٹے آئے دریچوں میں جھانکا چلے گئے
گرمی کی چھٹیاں تھیں وہاں کوئی بھی نہ تھا

اک لڑکی۔ ایک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی
میں اجلی دھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا

جیسے کہ سارے شہر کی بجلی چلی گئی
آنکھیں کھلی کھلی تھیں مگر سوجھتا نہ تھا

اَب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو، اگلے جنم تک میرا

آنکھیں آنسو دل بھی آنسو، شاید ہم سرتاپا آنسو
تھوڑی مٹی اور ملا دے ابھی بہت گیلی ہے مٹی

بارہا یہ ہمیں محسوس ہوا
دَرد سینے کا خدا ہو جیسے

پھول کی آنکھ میں شبنم کیوں ہے
سب ہماری ہی خطا ہو جیسے

میری آنکھوں میں اک چاندنی چوک ہے
گزری عمر رواں چاندنی چوک میں

میری آنکھ کے تارے اب نہ دیکھ پاؤ گے
رات کے مسافر تھے کھو گئے اُجالوں میں

جانے کس دیس سے دل میں آجاتے ہیں
چاندنی رات میں دَرد کے کارواں

بارشیں۔ چھت پہ کھلی جگہوں پہ ہوتی ہیں مگر
غم وہ ساون ہے جو ان کمروں کے اندر برسے

دل کی بستی پرانی دلّی ہے
جو بھی گزرا ہے اُس نے لوٹا ہے

وہ جن کے ذکر سے رگوں میں دوڑتی تھیں بجلیاں
انھیں کا ہاتھ ہم نے چھو کے دیکھا کتنا سرد ہے

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موج رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

کسی مصلحت سے بہار خود مرے لب کے پاس ٹھہر گئی
مری آرزو تھی خزاں کے خشک و اداس ہونٹوں کو چوم لوں

نہیں ہے میرے مقدّر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھولو ذرا صبح کی ہوا ہی لگے
عجیب شخص ہے ناراض ہو کے ہنستا ہے
میں چاہتا ہوں خفا ہو تو وہ خفا ہی لگے

اس کا بھی کچھ حق ہے آخر
اس نے مجھ سے نفرت کی ہے

بہت دنوں سے مرے ساتھ تھی مگر کل شام
مجھے پتہ چلا وہ کتنی خوبصورت ہے

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو مرا محبوب سمجھتے ہوں گے

سب کھِلے ہیں کسی کے عارض پر
اس برس باغ میں گلاب کہاں

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

خود اپنی ہی آہٹ پہ چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

خوبصورت، اداس، خوفزدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

ہنس پڑی شام کی اُداس فضا
اس طرح چائے کی پیالی ہنسی

یہ زعفرانی پلوور اسی کا حصّہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

وہ بالکونی میں آئے تو راستہ رک جائے
سڑک پہ چلنے لگے تو ہمارا جیسا ہے

مچھلیاں۔ چل رہی ہیں پنجوں پر
جن کے چہرے ہیں لڑکیوں جیسے

چاہا تھا میں نے چاند کی پلکوں کو چوم لوں
ہونٹوں پہ میرے صبح کے تارے بکھر گئے
میرے لبوں پہ چاند کی قاشیں لرز گئیں
آنکھوں پہ کالی رات کے گیسو بکھر گئے

میرے ہونٹوں پہ تیری خوشبو ہے
چھو سکے گی انھیں شراب کہاں

تیرے اور میرے پیار میں اکثر سارے جذبات مشترک ہیں مگر
دھوپ کتنی ہی مہرباں ہو جائے یہ کبھی چاندنی نہیں ہوتی

رات اک خواب ہم نے دیکھا ہے
پھول کی پنکھڑی کو چوما ہے

دو جھیلیں اس کی آنکھوں میں لہرا کے سو گئیں
اس وقت میری عمر کا دریا چڑھا نہ تھا
دو کالے ہونٹ جام سمجھ کر چڑھا گئے
وہ آب جس سے میں نے وضو تک کیا نہ تھا

رات تیری یادوں نے دل کو اس طرح چھیڑا
جیسے کوئی چٹکی لے نرم نرم گالوں میں

آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی، جیسے جھیلیں بھی ہوں، نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انھیں کچھ ہنسی آگئی، بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

جیسے کشمیری جھیلوں کی آغوش میں ننھے ننھے ستارے اتر آئے ہوں
رات ان نیلی آنکھوں میں کچھ ایسے ہی آنسوؤں کے دیے جھلملانے لگے ہے

یہ بات کہ صورت کے بھلے دل کے بُرے ہو
اللہ کرے جھوٹ ہو بہتوں سے سُنی ہے
ہم دلّی بھی ہو آئے ہیں لاہور بھی گھومے
اے یار مگر تیری گلی تیری گلی ہے

ایضاً

زندگی تری فکریں کھلتے ہی گلابوں کا رس نچوڑ لیتی ہے
پھول جیسی عمروں کے سوچتے ہوئے بچے بوڑھے ہوتے جاتے ہیں

قدم سے آگے آگے چل رہی ہے
مسافر کو گلی پہچانتی ہے

وقت سو منصفوں کا منصف ہے
وقت آئے گا انتظار کرو

جب کبھی بادلوں میں گھرتا ہے
چاند لگتا ہے آدمی کی طرح

آج کمرے میں نہیں بیٹھنے والا موسم
برف گرنے کی خبر گرم ہے گھر سے نکلو

میں دن ہوں میری جبیں پہ دکھوں کا سورج ہے
دیے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

شیشے کا تاج سر پہ رکھے آ رہی تھی رات
ٹکرائی ہم سے چاند ستارے بکھر گئے

میرے بستر پہ سو رہا ہے کوئی
میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

آج میں جاگوں گا کہ سوتے میں
میری پلکوں کو چومتا ہے کوئی

میرا شیطان مر گیا شاید
میرے سینے پہ سو رہا ہے کوئی

سات پردوں میں چھپ کے دیکھ لیا
کپڑے بدلو تو دیکھتا ہے کوئی

اب ہوئی داستاں رقم بابا
انگلیاں ہو گئیں قلم بابا

دودھ کی نہر ہر غزل ہوگی
اپنا تیشہ یہی قلم بابا

چاند اکثر اداس رہتا ہے
اس کو آخر ہے کس کا غم بابا

آہٹیں چلمنوں سے پوچھتی ہیں
قید کب تک رہیں گے ہم بابا

اب تو تنہائیاں بھی کہتی ہیں
ہے ترا بھی کوئی صنم بابا

عشق نے یہ بھی رتبہ ہم کو دیا
لوگ کہتے ہیں محترم بابا

سارے دن کی تپتی ساحلی ریت پہ دو تڑپتی ہوئی مچھلیاں سو گئیں
اپنے ملنے کی وہ آخری شام تھی لہریں آتی رہیں لہریں جاتی رہیں